قرآن مجید اور اس کی حفاظت

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

(۵)

(از جناب مولانا محمد بدر عالم صاحب میرٹھی استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل)

قرآن کریم متواتر بتواترِ طبقہ ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس پر دلائل قائم کرنا گویا آفتاب کو روشنی میں لانا ہے۔ اسلام کے اس دورِ انحطاط میں بھی حفظِ قرآن کی جو زندہ تاریخ ہماری آنکھیں مشاہدہ کر رہی ہیں وہ اس کے دورِ عروج کی حفاظت پر خود ایک تسکین بخش شہادت ہے۔ دورِ اول و ثانی کو ابھی رہنے دیجئے۔ میں آپ کے سامنے اس طبقہ کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں جس میں خود آپ موجود ہیں کیا آپ بہ انصاف کہہ سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم آپ کے طبقہ میں علی التواتر محفوظ نہیں۔ ہے اور ضرور ہے اسی طرح جو طبقہ آپ کے متصل ہے اس کے متعلق بھی اپنے کانشنس اور ضمیر سے شہادت طلب کیجئے یقین ہے کہ جہاں تک آپ کی نظریں انصاف کے ساتھ چڑھتی جائیں گی قرآن کا تواترِ طبقہ اسی قدر روشن اور محکم نظر آتا جائیگا۔

عام طور پر اعتراض کرنے والے اور جواب دینے والے اس تواتر کو عہدِ اول سے دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ چونکہ وہ عہد اس وقت ان کی نظروں سے غائب ہوتا ہے اس لئے عقل طرح طرح کے شبہات سامنے لے آتی ہے اور اس روشن حقیقت کا اسی مرحلہ پر انکار کر کے تواتر ہی کی منکر ہو جاتی ہے اس لئے میں قرآن کا تواتر اس دور سے شروع کرنا چاہتا ہوں جس میں آپ خود موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ کی

نظر دورِ حاضر کے نزول کے بجائے دورِ اول کی طرف صعود کرتی چلی جائے تو جس حقیقت کا آپ اپنے زمانہ میں اعتراف کریں پھر آئندہ دوروں میں اس کے انکار کی جرأت کبھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ صحیح فطرت ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ قرآن کریم اس طبقہ میں تو علی التواتر محفوظ ہو جو کہ اس کا ایک نہایت ضعیف دور ہے اور اس طبقہ میں غیر محفوظ رہے جو مسلمہ طور پر اس کے جاں نثاروں کا طبقہ ہو۔ اس کے بعد آپ غور کیجئے کہ اگر آپ اپنے زمانہ کے اس کھلے تواتر کو دلائل کی روشنی میں لانا چاہیں تو آپ کو حفاظ کی تعداد و شمار میں کسقدر دشواری لاحق ہوگی۔ کیا آپ اپنے زمانہ کے حفاظ کا بیک وقت علم رکھتے ہیں؟ نہیں رکھتے اور یقیناً نہیں رکھتے حالانکہ اس کے متواتر ہونے کا آپ کو یقیناً علم ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ تواترِ طبقہ کا یقین مردم شماری اور کسی خاص مقدار کے علم پر موقوف نہیں ہوتا بلکہ ہر طبقہ اپنے مافوق طبقہ سے طبقۃً بعد طبقۃٍ اس علم بدیہی کا تناقل کرتا چلا آتا ہے اور اس لئے یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہوتی ہے جس کا یقین پہلے ہو جاتا ہے اور دلائل کی زحمت اگر اٹھائی جائے تو بعد میں ہوتی ہے۔ پھر اگر بالفرض آپ کسی طرح ہندوستان میں اپنے دور کے یا تمام دنیا کے حفاظ کی فہرست جمع کر بھی لیں تب بھی وہ طبقہ جو آپ سے اوپر متصل ہے اس کے حفاظ کی مردم شماری آپ کے لئے قطعاً ناممکن ہے اسی طرح اگر دو چار طبقہ تک ہی میں آپ سے دریافت کروں تو یا لیقین آپ اسماء حفاظ کا احصار کرنے سے عاجز ہو جائیں گے اور بالآخر یہی کہہ سکیں گے کہ ہم اپنے اکابر سے طبقہ بعد طبقہ یونہی سنتے چلے آئے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ شاید آپ یوں کہہ دیں کہ یہ تو وہی اندھی تقلید ہوگی جس کو قرآن میں بزبانِ کفار یوں نقل کیا گیا ہے "اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ"۔ پھر اس کو حجت کیونکر کہا جا سکتا ہے مختصراً اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں نفس تقلید طبقہ کی مذمت نہیں ہے بلکہ اس طریق استدلال کی مذمت ہے یعنی محض کسی چیز کا نقل ہوتے چلا آنا اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہوتا اس لئے فرمایا کہ "اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ"۔ لہٰذا اگر گمراہی یونہی علی التواتر نقل ہوتی چلی جائے تو

کیا صرف اس وجہ سے کہ وہ نقل ہوتی چلی آئی ہے ہدایت بن جائیگی پھر یہ دلیل حقانیت کہاں سے بنی۔ لہذا اس استدلال سے اگر ثابت ہوگا تو صرف یہ کہ جس طرح ان کے باطل عقائد کا تناقل علی التواتر ہے اسی طرح خود ان کا باطل پرست ہونا بھی علی التواتر ہے۔ تواترِ طبقہ کے ثبوت و عدم ثبوت سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم مختصر جواب کے بعد آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جب آپ دو چار دوروں کے حفاظ کے ناموں اور ان کی تفصیل کے علم کے بغیر بلکہ اس سے عاجز ہوجانے کے بعد بھی ان دوروں میں قرآن کا تواترِ طبقہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں تو کیوں تیرہ سو سال قبل کے طبقہ کے اسماء اور ان کی تفاصیل کے علم کے بغیر اس دور کا تواتر تسلیم کرنے پر اگر مجبور نہیں ہوتے تو منکر کیوں ہوجاتے ہیں۔

انصاف پسند طبائع کو ہمیشہ بطور قاعدۂ کلیہ یاد رکھنا چاہئے کہ فطرت انسانی اس پر مجبور ہے کہ وہ اسی راستہ پر جاتی ہے جس پر ایک مرتبہ غلط یا صحیح طور پر وہ گامزن ہوچکی ہے۔ مشکوٰۃ شریف کے باب القدر میں آپ کے ایک حدیث ملیگی جس کا مضمون یہ ہے کہ شیطان اولاً انسان کو مخلوقات کے دائرہ میں اس سوال کی مشق کراتا ہے کہ فلاں شے کو کس نے پیدا کیا فلاں شے کو کس نے پیدا کیا حتیٰ کہ جب وہ مخلوقات کے دائرہ میں اس سوال و جواب کا خوب مشاق ہوجاتا ہے تو فطرت کی زبان سے یہ کہلواتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا۔ چونکہ اس کی فطرت اس مشاقی کے بعد ہی دیکھنے کی عادی ہوگئی تھی کہ ہر شے کسی دوسری شے سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اب اس کو کسی ذات کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا ایک عقدۂ لاینحل بن جاتا ہے۔ حدیث میں اس سوال و جواب کی جو تفصیل کی گئی ہے اس وقت وہ ہماری موضوع سے جدا ہے ہمیں تو صرف یہ دکھلانا ہے کہ فطرت جب ایک راستہ پر کچھ قدم چل لیتی ہے تو اُس کو چھوڑنا خواہ وہ کتنی ہی سیدھی کیوں نہ ہو اس کے لئے ذرا دشواری کا موجب ہوتا ہے۔ اسی عام قاعدہ کے ماتحت شرائع و عقائد کا باب ہے اگر ابتدائی قدم میں رسوخ میسر ہوگیا تو یقینِ سابق آئندہ شبہات کا خود بخود ازالہ کردیتا ہے اور اگر پہلا قدم ہی مذبذب ہے تو ہجوم وساوس حصولِ یقین کے لئے سدِ سکندری بن جاتا ہے۔

اسی طرح اگر آپ اس تواتر طبقہ کو دور اول سے دیکھنا شروع کریں گے تو بُعد زماں اور سینکڑوں قسم کے اختلافات کے ہنگاموں میں پھنسکر آپ کا طائر عقل پہلے ہی قدم پر مبہوت ہو جائیگا اور آپ کو اس وقت اتنے غور کرنے کی فرصت بھی نہ ہوگی کہ یہ دشواری اس لئے نہیں ہے کہ ثبوتِ تواتر میں کوئی اشکال ہی بلکہ اس لئے ہے کہ وہ طبقہ آپ کی نظروں سے غائب ہے۔ اسی لئے اگر آپ غور کریں گے تو اس تواتر کے انکار پر آپ کے سامنے کوئی معقول دلائل نظر نہ آئیں گے بجز اسی ایک طبعی ضیق اور وساوس کے جس کا منشا رصرف مخالفین کا شور وغوغا ہوگا اور بس۔ اگر مخالفین کا یہ شور آپ کے کانوں تک نہ پہنچتا تو یقین کیجئے کہ جس طرح آپ اپنے دور کے تواتر کو بلا کسی استدلال کے تسلیم کر چکے ہیں۔ اسی طرح اس بعید العہد تواتر کو آپ عہدِ حاضر سے متصل کر دیتا ہے اس لئے ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ اب ہم قرآنِ کریم کے تواتر کے ثبوت کا بار اپنی گردن پر اٹھائیں بلکہ خود مخالفین سے یہ سوال کرنا بجا ہے کہ اگر کسی دور میں یہ تواتر منقطع ہوا ہے تو ان کو کوئی طبقہ ایسا پیش کرنا چاہیئے جس میں قرآن کا یہ تواتر منقطع ہوا ہے۔ ہم جس صفائی کے ساتھ تورات و انجیل کے حاملین کو ان کی سند کے انقطاع کی داستان سنا چکے ہیں حق بجانب ہوگا اگر اسی صفائی کے ساتھ ہم اس انقطاع کا ثبوت قرآنی تواتر کے متعلق طلب کریں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جبکہ اسلام اپنے نازک ترین دور سے گذر رہا تھا اور حفاظِ قرآن بکثرت شہید ہو رہے تھے اس وقت بھی یہ تواتر منقطع نہیں ہوا۔ بلکہ کسی دور میں نظر میں جمع قرآن کا اس وقت خیال اگر پیدا ہوا تو وہ بھی مستقبل کے خطرات کے پیشِ نظر۔

حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے درمیان جو گفت وشنید جنگِ یمامہ میں ہوئی ہی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کثرت سے حفاظ کی شہادت کے بعد بھی عام طور پر اس وقت جمع قرآن کا خیال نہیں تھا بلکہ یہ صرف عمر فاروقؓ کا ایک جذبہ تھا جس کی بہت ردّ وکد کے بعد خلیفۂ وقت نے موافقت فرمائی تھی وہ بھی اس لئے کہ اگر اسی طرح آئندہ بھی حفاظ کی شہادت کی گرما گرمی رہی تو خطرہ ہے کہ کوئی حصہ کہیں قرآن کا ضائع نہ ہو جائے۔ یہ وہی طبقہ ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا ہوئے ابھی کچھ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر

حفاظ کی یہ کثرت ہے کہ ستر ستر حفاظ قرآن ایک جنگ میں شہید ہو جاتے ہیں اور قرآن ہے کہ بے کم و کاست محفوظ چلا جاتا ہے۔ کچھ خطرہ اگر ہے تو مستقبل کے متعلق ہے اس طبقہ میں تو صناع کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ تواتر طبقہ کے لئے آپ کو اور کیا درکار ہے۔ شاید آپ یہ کہیں گے کہ اس طبقہ میں قرآن متواتر سہی مگر اس کی کیا شہادت ہے کہ سارا قرآن صحابہ کو محفوظ تھا۔ ممکن ہی نہیں بلکہ یقیناً بہت سے صحابہ ایسے تھے جن کو صرف کچھ حصہ قرآن کا یاد تھا۔ نیز یہ ظاہر ہے کہ جس طرح کل قرآن کو قرآن کہا جاتا ہے اسی طرح بعض قرآن پر بھی قرآن ہی کا اطلاق ہوتا ہے پھر کیا ضروری ہے کہ جہاں لفظ قرآن کا آیا ہو اس سے مراد سارا قرآن ہی لیا جاوے۔ اولاً تو اس کا جواب اسی گفتگو میں موجود ہے جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مابین ہوئی کیونکہ جب شہادت قراء سے کسی حصہ قرآن کے ضائع ہو جانے کا خطرہ آئندہ زمانہ کے متعلق بیان کیا جا رہا ہے تو بداہتہً معلوم ہو گیا کہ اس وقت تک سارا قرآن محفوظ تھا اور اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہوا تھا رہا یہ کہ قرآن کا اطلاق مجموع اور بعض پر یکساں ہو سکتا ہے تو یہ ٹھیک ہے مگر ثبوت تواتر کے لئے یہ شرط ہی نہیں ہے کہ ہر ہر فرد کو پورا پورا قرآن یاد ہو بلکہ مجموع قرآن اگر مجموع صحابہ کو علی التواتر محفوظ تھا تب بھی کافی ہے

فرض کیجئے کہ سو صحابہ نصف اول کے حافظ ہوں اور سو نصف آخر کے۔ تو گو ہر سو پورے قرآن کا حافظ نہ سہی مگر مجموع صحابہ میں تو قرآن متواتر ہی رہیگا۔ اسی لئے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ولیس من شرط التواتر ان یحفظ کل فرد جمیعہ بل اذا حفظ الکل الکل ولو علی التوزیع کفی[1]۔ میں کہتا ہوں کہ حافظ نے یہ تفصیل اختلاف احرف کے ذیل میں فرمائی ہے مگر نفس قرآن کے متعلق اس تفصیل کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ بہت سے صحابہؓ ایسے تھے جن کو سارا قرآن محفوظ تھا۔ بیچارہ سرولیم جب قرآن کے اس درخشاں تواتر کا انکار نہ کر سکا تو اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھتا ہے "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں چار پانچ صحابہ تو ایسے موجود تھے جو کامل قرآن شریف کو نہایت صحت کے ساتھ ازبر رکھتے تھے اور اکثر ایسے موجود تھے جو قریباً سارا قرآن ازبر رکھتے تھے"

---

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۴۴۔

سرولیم کا مغالطہ | غنیمت ہے کہ سرولیم صحابہ میں حفاظ کی اکثریت کا قائل تو ہے اور کیونکر نہ ہو جبکہ ان کی زندہ تاریخ اس پر شاہد عدل ہو کہ ان کی حیات کا محبوب ترین وظیفہ یہی حفظ قرآن تھا۔ اس عیاں شہادت کے باوجود سرولیم انصاف کا خون کرتا ہے اور دبی زبان سے قریباً سارا کا لفظ اس لئے اضافہ کر جاتا ہے کہ قرآنی تواتر ثابت نہ ہونے پائے مگر اس بیچارہ کو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے جبکہ ثبوت تواتر کے لئے یہ شرط ہی نہیں ہے کہ سب صحابہ کو سارا ہی قرآن یاد ہو۔ مجموعۂ قرآن کے متعلق صرف چار پانچ صحابہ کا عدد بتلانا تو یہ بھی ایک مغالطہ ہے جو سرولیم کو بعض احادیث کے الفاظ سے پیدا ہوا ہے۔

حضرت قتادہؓ روایت فرماتے ہیں قال سألتُ انس بن مالکؓ من جمع القرآن علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اربعۃٌ کلھم من الانصار۔ ابی بن کعب ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت وابوزید (صحیح بخاری) حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ کس کس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن حفظ کر لیا تھا فرمایا کہ چار اشخاص نے جو سب قبیلہ انصار کے تھے الخ

یہ وہ حدیث ہے جس سے سرولیم کو مغالطہ لگا ہے۔ کاش اگر سرولیم احادیث اور شروح کا مطالعہ بغور کر لیتا تو اس کو یہ شبہات پیش نہ آتے اگر درحقیقت حضرت انسؓ کا یہ فرمان اس کو مقتضی ہے کہ سوائے ان چار صحابہ کے اس زمانہ میں کوئی اور حافظ قرآن نہ تھا تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا جسکو حضرت مسروق براہ راست لسان نبوت سے نقل فرماتے ہیں۔ خذوا القرآن من اربعۃ عن عبداللہ بن مسعود وسالم۔ ومعاذ۔ وابی بن کعب (صحیح بخاری) اس حدیث سے ظاہر ہے کہ خود لسان نبوت سے جن چار سے تعلم قرآن کا امر ہوا ہے ان میں بجائے زید اور ابوزید کے ابن مسعود اور سالم رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ یہ وہی سالم ہیں جن کے متعلق حافظ ابن حجر روایت فرماتے ہیں۔ فلما قتل سالم مولی ابی حذیفۃ خشی عمر ان یذھب القرآن الخ (فتح الباری باب جمع القرآن) یعنی جب حضرت سالم کی شہادت کی نوبت پہنچی تو عمرؓ کو ضیاع قرآن کا خطرہ لاحق ہو گیا اس سے ظاہر ہے کہ حضرت سالمؓ کا حفاظ میں کیا رتبہ تھا مگر ان سالمؓ کا حضرت

انسؓ کی حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اعداد کی تخصیص درحقیقت کسی خاص لحاظ اور خاص اعتبار پر مبنی تھی۔

کرمانی فرماتے ہیں کہ صحابہ کی اس کثرت کے بعد حضرت انسؓ کا یہ قول علی الاطلاق کیسے قابلِ تسلیم ہوسکتا ہے ظاہر ہے کہ یہ حکم لگانا اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہر ہر صحابی سے حضرت انس کا لقا تسلیم نہ کیا جاوے اور یہ بھی ثابت نہ کیا جائے کہ ہر ہر صحابی سے انھوں نے حفظ قرآن کا سوال کیا تھا اور انھیں سے ہر ہر شخص نے اس کا اقرار بھی کیا تھا کہ اُسے سارا قرآن یاد نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب مقدمات زیرِ تردد ہیں عقل باور نہیں کرتی کہ مختلف بلاد میں صحابہ کے تفرق کے باوجود حضرت انس سب سے جاکر ملے تھے اور اگر ملے تھے تو سب سے یہ سوال وجواب بھی ہوا تھا ہاں اگر یہ بیان حضرت انسؓ کا صرف اپنے علم کے اعتبار سے ہے تو البتہ کسی حد تک درست ہوسکتا ہے مگر اس سے اور صحابہ کے حفظ کی نفی اگر لازم آئے گی تو وہ بھی ان کے علم ہی کے اعتبار سے ہوگی نہ کہ واقع اور نفس الامر کے لحاظ سے (فتح الباری)۔

اسی لئے حافظ نے اس کی متعدد شروح نقل فرمائی ہے جن میں سب سے بہتر احقر کے نزدیک یہ ہے کہ اوس وخزرج ہر دو قبیلوں کا نزاع چونکہ تاریخ میں ثابت ہے اس لئے ہر ہر قبیلہ ایک دوسرے کے بالمقابل فخر کرنے کا عادی تھا حضرت انسؓ چونکہ قبیلۂ خزرج سے تھے اس لئے ان کا مطلب یہ تھا کہ اس میں کوئی ایسا نہیں ہے جو سارے قرآن کا حافظ ہو اور ہمارے قبیلہ میں چار حافظ موجود ہیں۔ ہمارے اس بیان کی تائید طبری کی اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے اس قصہ کی ابتدا کے متعلق نقل فرمائی ہے۔

افتخر الحیان الأوس والخزرج فقال الاوس	قبیلۂ اوس نے خزرج کے مقابلہ میں یہ کہا کہ ہمارے
منا اربعۃ من اھتز لھا العرش .. فقال	قبیلہ میں چار شخص ایسے ہیں جن کے لئے عرش حرکت
الخزرج منا اربعۃ جمعوا القرآن لم	میں آگیا اس پر خزرج بولے کہ ہم میں چار شخص ایسے
یجمعہ غیرھم۔ (فتح الباری)	ہیں کہ انھوں نے قرآن حفظ کیا ہے اور ان کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

طبری کی اس روایت نے فیصلہ کردیا کہ حضرت انسؓ کے اس بیان کو تمام طبقۂ صحابہؓ سے کوئی واسطہ نہیں تھا بلکہ وہ صرف قبیلۂ اوس کے بالمقابل ازراہِ فخر اپنے قبیلہ کے چار حفاظ کا ذکر فرما رہے تھے، میں کہتا ہوں کہ اس پر ایک قرینہ خود اسی حدیث میں موجود ہے اور وہ یہ کہ جب حضرت انسؓ سے سوال کیا گیا کہ من ابوزید۔ تو جواب میں فرمایا کہ احد عمومتی، یہ تعارف اپنے رشتہ سے کرانا دلالت کرتا ہے کہ مقصود وہی ہے جو طبرانی کی روایت میں موجود ہے۔

لہٰذا سرولیم کا یہ سمجھ لینا کہ اس وقت سارے صحابہ میں کل یہی چار حافظ تھے محض غلط ہے۔ مزید براں میں کہہ چکا ہوں کہ اثبات تواتر کے لئے یہ شرط ہی کب ہے کہ بقدر تواتر صحابہ کو سارا قرآن یاد ہو۔ بلکہ اگر مجموعِ صحابہ کو مجموعِ قرآن یاد ہو جب بھی اثبات تواتر کے لئے کفایت کرتا ہے۔

الغرض یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن سارا کا سارا عہدِ صحابہ میں محفوظ تھا اور یہ احتمال پیدا کرنا کہ ممکن ہے اس وقت کوئی حصہ قرآن کا رہ گیا ہو ایک وسوسہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ کسی ایک روایت سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وحیِ الٰہی کی تبلیغ میں کبھی کسی خاص مضمون کا لحاظ یا خاص فرقہ کی رعایت کی ہو بلکہ بلا تخصیص ہر شخص کو جو حصہ قرآنِ کریم کا نازل ہوتا وہ فوراً سنا دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آیات جو کہ شانِ نبوت میں ذرا عتاب کے لہجہ میں اتریں وہ بھی بلا امتیاز اسی اہتمام کے ساتھ صحابہ کے عام مجامع میں سنادی جاتی تھیں جیسا کہ وہ آیات جو کہ شانِ نبوت میں محبت و عظمت سے لبریز نازل ہوتیں۔ صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی آیت کا اخفا منظور ہوتا تو اس آیت کا اخفا فرماتے جو حضرت زینبؓ کے نکاح کے قصہ میں نازل ہوئی وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ۔ اس لئے بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کا ہر ہر جزء اور اس کی ایک ایک آیت عوام و خواص تک ہمیشہ سنادی جاتی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ قرآن سارا کا سارا ہی محفوظ ہو جائے ہاں اگر کسی مضمون کی تخصیص یا کسی فرقہ کی تخصیص کی جاتی تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ بعض قرآن محفوظ ہے اور بعض غیر محفوظ۔

معترض کا فرض ہے کہ وہ ان اسباب و وجوہ کو بھی ظاہر کرے جو اس تفریق کا منشا بن سکتے ہیں ہمارے نزدیک تو حفظ قرآن کے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں وہ قرآن کے کسی جزء کے ساتھ مخصوص نہ تھے یعنی تبلیغ کا امر عام طور پر اس کا سنایا جانا۔ اس کے حفظ کی ترغیب، مدارج حفظ کے لحاظ سے مناصب کی تقسیم۔ اس کا فطری انجذاب اور سب سے بڑھکر صحابہ کرام کا عام طور پر اس سے والہانہ عقیدہ۔ یہی اسباب تو تھے جنھوں نے اس کے ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ کو ان کے قلوب کی رونق بنا دیا تھا اب ہم کو بتایا جائے کہ آخر ان اسباب میں سے کونسا سبب تھا جو قرآن کے کسی جزء میں تو موجود تھا اور کسی میں نہ تھا جس کی بنا پر بعض قرآن تو محفوظ رہا اور بعض ضائع ہو گیا۔

یہ یاد رہے کہ اس وقت ہماری بحث منطقی اور صرف احتمالات عقلیہ سے نہیں ہے بلکہ واقعات اور صحیح تاریخ سے ہے اس لئے ایک آدھی مثال بھی ایسی پیش کرنی چاہئے کہ فلاں آیت تھی جو ان اسباب کے ماتحت ضائع ہو گئی۔

یہ بات بھی قابل فراموشی نہیں ہے کہ جو شہادت جس دور کے متعلق ہو ضروری ہے کہ اس کا ثبوت بھی اسی دور کے افراد میں ملنا چاہئے لہٰذا صحابہ کے دور کے متعلق صحابہ کی یہ زبانی شہادت ملنی چاہئے کہ درحقیقت قرآن کا کوئی حصہ ایسا بھی تھا جو قرآن رہتے ہوئے ان کے ہاتھوں سے ضائع ہو گیا تھا اس جگہ منسوخ التلاوۃ آیات کا پڑھنا کھلی حماقت ہو گی کیونکہ کلام ان آیات کے متعلق ہے جو علی سبیل التواتر قرآن تسلیم کی گئی ہوں اور پھر اس عہد میں فراموش ہو گئی ہوں۔ اگر صحابہ کے عہد کے متعلق کوئی شہادت اس زمانہ کی دستیاب نہیں ہو سکتی تو بعد کی قیاس آرائیاں کیا نافع ہو سکتی ہیں۔ ہاں یہ قرائن اس وقت نافع ہو سکتے ہیں اگر صحابہ میں کتمان حق۔ قرآن سے بیزاری اور تغافل، کذب و افترا کے عادت العیاذ باللہ تسلیم کر لی جاوے۔ مگر صحابہ کی حق گوئی قرآن پر ان کی پروانہ وار جاں نثاری ان حقائق ثابتہ میں سے ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کی حق گوئی ان جوابات سے ظاہر ہے جو امراء جور کے سامنے انھوں نے رو در رو دیئے ہیں اور

قرآن سے ان کا شغف صحیح بخاری کے اس واقعہ سے واضح ہے جس میں ایک صحابی کھڑا ہوا قرآن پڑھ رہا ہے دشمن کا تیر اس کو زخمی کر دیتا ہے حتیٰ کہ جب اس کا خون اس کے ساتھی کے منہ پر گرتا ہے اور وہ گھبرا کر جاگ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اے بھائی تو نے پہلے سے کیوں نہ کہا تھا کہ میں تیرے دشمن سے انتقام لے لیتا تو وہ جواب دیتا ہے کہ لذتِ تلاوت میں یہ گوارا نہ ہوا کہ جو سورت قرآن کی شروع کر چکا تھا اسے تمام کرنے سے قبل تجھکو بیدار کرنے میں مشغول ہوتا۔

جو اشخاص قرآنِ کریم کی تلاوت میں یہ راحت محسوس کرتے ہوں ان کے متعلق یہ کہنا کہ انھوں نے کوئی جزء اس کا تلف کیا ہوگا یا اتفاقاً ان سے کوئی جزء رہ گیا ہوگا کس قدر بعید از قیاس ہے اور اگر بالفرض ایسا ہوتا تو بھی یہ یقینی ہے کہ سب سے اول اس محرومی پر نوحہ کرنے والے بھی یہی افراد ہوتے۔ احرف قرآن میں اختلاف بیشک ان کے عہد میں شائع تھا مگر اس سلسلہ میں جو نرم و گرم گفت و شنید کی نوبتیں آئیں وہ بھی جوں کی توں اسلامی تاریخ میں موجود ہیں۔ پس جس قوم کی تاریخ اس قدر صاف اور سچی ہو کہ بلا لحاظ نفع وضرر ہر بات اس میں درج ہو کیسے ممکن ہے کہ قرآن جیسی کتاب کا کوئی حصہ ان سے ضائع ہو جائے اور وہ خاموش رہیں۔ حفاظ کی شہادت سے آئندہ کے متعلق جو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اس کا ذکر تو احادیث میں موجود ہو اور العیاذ باللہ ضائع شدہ قرآن کا کہیں نام تک نہ آئے۔ کیسے ممکن ہے اسی لئے ہم نے نہایت اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی تھی کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی باہمی گفتگو سے یہ بہت وضاحت سے سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت تک سارا قرآن صحابہ میں موجود تھا اور اس کا کوئی جزء تلف ہونے نہ پایا تھا نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک قرآن کی حافظ کوئی خاص جماعت نہ تھی بلکہ عام طور پر جو صحابہ بھی حافظ تھے وہی اس کے محافظ تھے اسی لئے قراء کی شہادت پر ضیاع کا خطرہ تھا۔ اگر خدانہ کردہ کسی کے دل میں کوئی خیانت ہوتی تو وہ خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہے حفاظ شہید ہو جاویں تو ہمارے لئے قرآن میں کمی بیشی کا موقع ہاتھ آجائے مگر جس کو اندھی دنیا دشمن قرآن کہتی ہے در حقیقت وہی اس کا اول محافظ تھا اس لئے اس نے چاہا کہ جمع قرآن کا انتظام ایسے دور میں ہونا چاہئے جبکہ حفاظ

موجود ہوں خلیفۂ وقت متفق ہو جاوے اور اس اہم کام کو ان ہی صحابہ کے سامنے سرانجام دیدیا جاوے جن کے سامنے وہ نازل ہوا ہے۔ آئندہ اس کی تفصیل آپ کے ملاحظہ سے گذرنے والی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس وقت تو صرف یہ بتانا ہے کہ جو تاریخ اپنے چھوٹی چھوٹی فروگذاشت دنیا کے سامنے رکھ رہی ہے اگر کہیں وہ اس جرم میں مبتلا ہو جاتی تو یقیناً کبھی خاموش نہ رہتی اور صفائی سے اس محرومی یا جرم کا بھی اقرار کر لیتی۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ احرف کا اختلاف کیوں پیدا ہوا اور کیا یہ اختلاف نفس قرآن کے تواتر پر کچھ اثر انداز ہو سکتا ہے تو اس کی تحقیق ہم آئندہ ذکر کریں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس تفصیل کے بعد طبقہ صحابہ میں قرآنی تواتر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا ہو گا اور اب ضرورت نہیں کہ اس سے زیادہ ہم کچھ اور لکھیں مگر تبرعاً ہم مشتے نمونہ از خروارے، ان صحابہ کے چند اسماء بھی پیش کرتے ہیں جو تاریخ نے عبرت آموز دنیا کے لئے صفحۂ قرطاس میں امانت رکھ چھوڑے ہیں۔

حافظ بدرالدین عینی شرح بخاری میں فرماتے ہیں[۵۱] "ابو عمر دانی لکھتے ہیں کہ خلفاء اربعہ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ ابن عساکر محمد بن کعب قرظی سے نقل کرتے ہیں کہ عبادۃ بن الصامت اور ابو ایوب اور خالد بن زید نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیوۃ ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ ابن اسحاق نے ابو موسیٰ اشعری اور مجمع بن جاریۃ کو بھی اسی دور کے حفاظ میں شمار کیا ہے۔ ابو عبید بن سلام نے قیس بن صعصعہ اور عمرو بن زید کے اسماء مبارکہ کا اس میں اور اضافہ کیا ہے ابن حبیب نے اس دور کے حفاظ قرآن کی ایک جماعت شمار کی ہے جس میں سعد بن عبید بن نعمان کا نام بھی لکھا ہے۔ ابن اثیر نے قیس بن السکن اور ام ورقۃ بنت نوفل اور قیل بنت عبداللہ کو بھی انہیں حفاظ کی فہرست میں لکھا ہے۔ ابو عبید نے قراء صحابہ کے اسماء مبارکہ لکھتے ہوئے مہاجرین اربعہ۔ طلحہ۔ سعد۔ ابن مسعود۔ حذیفہ، سالم، ابو ہریرۃ، عبداللہ بن السائب، عبادلہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور عورتوں میں ام المومنین

---

۵۱ عینی شرح بخاری ج ۹ ص ۳۱۵۔

صدیقہ عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ کے نام نامی بھی اسی دور کے حفاظ میں شمار کرائے ہیں۔ ابن ابی داؤد نے مہاجرین میں سے تمیم بن اوس داری اور عقبۃ بن عامر۔ اور انصار میں سے معاذ جن کی کنیت ابو حلیمہ تھی اور فضالہ بن عبید اور مسلمۃ بن مخلد کے اسماء بھی اسی فہرست میں درج کئے ہیں۔

حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ ص۹ پر حضرت عثمانؓ اور ص۱۲ پر حضرت علیؓ اور ص۱۳ پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ص۱۶ پر عقبۃ بن عامرؓ کو حفاظ قرآن میں لکھا ہے۔ طبقات ابن سعد[۱] میں قراء صحابہ کا ایک مستقل باب ہے اور اس میں ابی بن کعب اور معاذ بن جبل۔ ابو الدرداء، زید بن ثابت، سعد، ابو زید، عثمان بن عفان، تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو شمار کیا ہے۔ اور مجمع بن جاریۃ کے متعلق لکھا ہے کہ وکان مجمع بن جاریۃ قد جمع القرآن الا سورتین وکان ابن مسعودؓ قد اخذ بضعا وستین سورۃ وتعلم بقیۃ القرآن من مجمع۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عہد نبوی میں سارا قرآن حفظ کیا تھا یا نہیں اس میں آثار کا کچھ اختلاف ہے ملاحظہ ہو مقدمہ تفسیر قرطبی وغیرہ۔

حافظ ابن عبدالبر قیس بن السکن کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان کی کنیت ابو زید ہے اور یہ ان چار صحابہ میں سے ہیں جنھوں نے عہد اول ہی میں قرآن یاد کر لیا تھا۔ ابو عمر کہتے ہیں کہ جمع سے مراد یہ ہے کہ انصار میں سے ان چار اشخاص نے جمع کیا تھا ورنہ جمع کرنے والے ان کے سوا بھی اور جماعت ہے جن میں سے عثمانؓ۔ علیؓ، ابن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرو العاصؓ، سالم رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں[۲]

سالم بن معقل کو حفاظ میں لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ یہ بزرگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف آوری سے قبل قبا میں مہاجرین کے امام تھے[۳]

ناظرین غور کریں کہ حفظ قرآن کا آخر وہ کیا نظم ونسق ہوگا کہ ابھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۱۲ قسم دوم۔ [۲] استیعاب ج ۲ ص ۵۲۴۔ [۳] ایضاً ج ۲ ص ۵۶۱۔

بھی نہیں لائے کہ حفظ قرآن کا درس شروع ہے اور نمازوں میں قرآن شریف کی تلاوت ہو رہی ہے۔

سعید بن عبید کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ یہ سعد قاری کے نام سے مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ یہ ان چار حضرات میں سے تھے جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی قرآن حفظ کر لیا تھا اور ابو زید ان ہی کی کنیت ہے [1] ابو زید در حقیقت کس کی کنیت تھی اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں یہی کہا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ سلیمان بن ابی حثمہ ان کا تذکرہ استیعاب میں ملاحظہ ہو۔ [2]

ہم نے وقت کی فرصت کے لحاظ سے حفاظ صحابہؓ کے یہ چند اسماء پیش کئے ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان سب کو سارا ہی قرآن محفوظ تھا اور نہ اس کی ہم کو حاجت ہے مگر جو امر کہ قابل یادداشت ہے وہ صرف یہ ہے کہ بعض حضرات کہیں کہیں ان کے حفظ کی تفصیل دیکھکر یہ سمجھے ہیں کہ ان کو پورا قرآن یاد نہیں تھا حالانکہ جہاں کہیں اس کا تذکرہ ہے اس سے سارا قرآن ہی مراد ہے۔ ابھی عبداللہ بن مسعودؓ کے حال میں آپ نے پڑھا کہ انھوں نے گو عہد نبوت میں پورا قرآن حفظ نہ کیا ہو مگر بعد میں قرآن مجمع بن جاریہ سے پورا کر لیا تھا اس لئے ہر جگہ یہ بات زیر نظر رہنی چاہئے کہ جہاں جس صحابی کے متعلق بعض قرآن کا تذکرہ ہے کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اپنی آخری عمر تک اتنا ہی یاد تھا یا اس کے بعد اس نے پورا کر لیا تھا۔ اگر آپ کا وجدان صحیح ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس صحابی نے حفظ قرآن شروع کیا ہو تو اس نے بلا کسی خاص سبب کے یونہی نامکمل چھوڑ دیا ہوگا آج بھی جو بچہ حفظ قرآن شروع کر دیتا ہے بلا وجہ وہ بھی جب تک پورا نہ ہو جائے ترک نہیں کرتا۔ چہ جائے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ پھر یہ بات بھی قابل فراموشی نہیں ہے کہ حفاظ قرآن میں وہ صحابہ بھی ہو سکتے ہیں جن کو پورا قرآن پہنچ ہی نہ سکا۔ کیونکہ اس وقت نازل ہو رہا تھا جس کو جتنا مل سکا اتنا ہی ان سے حفظ کر لیا۔

غرض کسی کو کل اور کسی کو بعض قرآن اس قدر عام طور پر محفوظ تھا کہ اگر یہ کہدیا جائے کہ اس عہد کے

---

[1] استیعاب ج ۲ ص ۵۵۰ - [2] استیعاب ج ۲ ص ۵۵۹ -

مسلمانوں میں کوئی مسلمان بھی ایسا نہ تھا جس کے سینہ میں کچھ نہ کچھ قرآن محفوظ نہ ہو تو قطعاً صحیح اور مبالغہ سے خالی ہوگا اسی لئے شیخ بدرالدین حسینی حفاظ کے چند اسمار لکھکر فرماتے ہیں۔ وقد ظهر من هذا ان الذين جمعوا القرآن على عهده صلے الله عليه وسلم لا يحصيهم احد ولا يضبطهم عدد۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے حفاظ عدد و شمار سے باہر تھے۔ بلاشبہ شیخ نے سچ فرمایا جب آپ اپنے دور کے حفاظ کے اسمار شمار نہیں کر سکتے تو اس دور کے اسمار کہاں سے شمار کئے جا سکتے ہیں جو ہم سے ۱۳۰۰ سال قبل ہے یہ بھی تعجب ہے کہ تاریخ نے ابھی تک اتنی تعداد کیسے محفوظ رکھی اور جس نے سرولیم جیسے شخص کو یہ لکھ دینے پر مجبور کر دیا کہ اکثر صحابہ کو تقریباً سارا قرآن ازبر تھا۔ اب میں آپ کو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ آخر اس عام رغبت اور والہانہ جذبہ حفظ کا داعیہ کیا ہوا۔

قرآن کریم صرف قصص و عبر کی کوئی کتاب نہ تھی جسے پڑھکر صحابہ کرام اپنے ایمان کو تازہ کر لیا کرتے بلکہ وہ ان کی زندگی کا ایک مکمل دستور العمل تھا جس کی طرف قدم قدم پر ان کو احتیاج تھی۔ اس لئے لازمی طور پر اس کی حفاظت ان کا جذبۂ فطری بن گیا تھا۔ ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے حفظِ قرآن کے فضائل سن سنکر ان کے قلوب میں یہ جذبہ اس قدر موجزن تھا کہ سوائے اس مشغلہ کے کوئی دوسرا مشغلہ ان کو بھلا نہ لگتا تھا۔ ابو عبدالرحمٰن تعلیم قرآن کی فضیلت نقل فرما کر کہتے ہیں کہ وذالك الذى اقعدنى مقعدى هذا وعلم القرآن فى زمن عثمان حتى بلغ الحجاج بن يوسف[1]۔ یعنی ان ہی فضائل نے مجھکو یہاں پڑھانے کی خدمت کے لئے بٹھا رکھا ہے۔ چنانچہ یہ خدمت حجاج کے زمانہ تک انجام دیتے رہے۔

یوں تو فضائل قرآن اتنا وسیع باب ہے جس پر تقریباً ہر کتاب میں مستقل مستقل باب لکھا گیا ہے اس کو بھلا یہاں کیا لکھا جا سکتا ہے مگر ہم اس جگہ صرف دو حدیثیں بعض اہمیت کی بنا پر ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

---

[1] ترمذی شریف ج ۲ ص ۱۱۴۔

حکیم ترمذی نوادر الاصول[۵۱] میں مرفوعاً نقل کرتے ہیں لا تغرنکم ھذہ المصاحف المعلقۃ ان اللہ لا یعذب قلباً وعی للقراٰن[۵۲] یعنی ان لٹکے ہوئے قرآنوں بھروسہ کرکے حفظ قرآن ترک نہ کر دینا کیونکہ جس دل میں قرآن محفوظ ہوتا ہے خدا تعالیٰ اسے عذاب نہیں کرتا۔

اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوت میں لکھے ہوئے قرآن کی بھی کافی کثرت تھی۔

دوسری حدیث حضرت بریدہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان اھل الجنۃ یدخلون علی الجبار کل یوم مرتین فیقرأ علیھم القراٰن فاذا سمعوا منہ کانھم لم یسمعوہ قبل[۵۳]۔ اہل جنت ہر دن بارگاہِ جبار میں دو مرتبہ داخل ہوں گے ان پر قرآن کی تلاوت کی جاوے گی جس وقت وہ سنیں گے تو ان کو ایسا معلوم ہوگا کہ اس سے قبل گویا کبھی سنا ہی نہ تھا۔

اسی طرح مسلم کی حدیث یؤم القوم اقرأھم۔ اسی حقیقت پر مبنی ہے اس کا مطلب عام طور پر صرف یہ سمجھا گیا ہے کہ اس حدیث نے احق بالامامۃ کا فیصلہ کیا ہے مگر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک اور لطیف حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وسبب تقدیم الاقرأ انہ صلی اللہ علیہ وسلم	امامت کیلئے اس شخص کو زیادہ مناسب سمجھنا
حدّ للعلم حدًا معلوماً کما بینا وکان اول	جس کو قرآن زیادہ یاد ہو اسلئے ہے کہ نبی کریم صلی اللہ
ما ھنالک معرفۃ کتاب اللہ لانہ اصل العلم	علیہ وسلم نے علم کے ایک حد مقرر فرمائی تھی چونکہ
وایضاً فانہ من شعائر اللہ فوجب ان یقدم	قرآن کریم جملہ علوم کی اصل ہے لہٰذا کتاب اللہ کے

[۵۱] یہ حکیم ترمذی صاحب جامع نہیں ہیں ان کا مختصر تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی بستان المحدثین میں لکھا ہے۔ ان کی کتاب نوادر الاصول احقر کی نظر سے بھی گذری ہے۔ روایات محتاج نقد ہیں اس کے اسباب و وجوہ اپنی جگہ بتلا دیئے گئے ہیں جو اہلِ علم پر مخفی نہیں ہیں۔

[۵۲] اتحاف ج ۴ ص ۴۶۵۔

[۵۳] اتحاف ج ۴ ص ۴۶۶۔

صاحبہ ویتوہ بشأنہ لیکون ذلک (اوعی) الی التنافس فیہ ولیس کما یظن ان السبب احتیاج المصلی الی القراءۃ فقط ولکن الاصل حملھم علی المنافسۃ فیھا وانما تدل ذلک الفضائل بالمنافسۃ [1]

معرفۃ ہی معیار علم مقرر کر دیا گیا تھا نیز چونکہ قرآن خدائیتعالٰی کے شعائر میں سے ہے لہذا لازم ہے کہ حافظ کی زیادہ قدر و منزلت کی جاوے اور امامت میں اسی کو مقدم رکھا جائے تاکہ اس کی طرف رغبت پیدا ہو کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جس قدر منافست زیادہ ہوتی ہے اسی قدر فضائل کی طرف قدم تیزی سے بڑھتا ہے۔ دراصل اس تقدیم میں اس ترغیبِ حفظ کا رمز مضمر تھا صرف اتنی ہی بات نہیں تھی کہ مصلی چونکہ اپنی نماز میں رکن قرأۃ کا محتاج ہے اس لئے اقرأ کو مقدم کیا گیا [2]

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اس پُر معنی تقریر سے ظاہر ہے کہ شریعۃ غرا میں حفظ قرآن کے لئے ترغیبی پہلو کا تعلق صرف ثواب سے نہ تھا بلکہ دنیا میں بھی اس کو اشرف سمجھا جاتا تھا جیسا کہ عہدۂ امامت جیسے اہم منصب کے لئے اس کی احقیت سے واضح ہے۔ [3]

---

[1] حجۃ اللہ ج ۲ ص ۲۶ -

[2] اقرأ کا احادیث میں کثرت سے حافظ پر اطلاق ہوا ہے۔ جسے ہم اپنی اصلاح میں قاری کہتے ہیں اسے عربی میں مُجوّد کہا جاتا ہے لہذا یہاں حدیث میں قاری سے مراد مجوّد نہ لینا چاہیئے۔ رہا مسئلہ فقہیہ کا فیصلہ تو اس کے لئے حجۃ اللہ کا بقیہ مضمون دیکھئے۔

[3] کوئی شخص عہدِ نبوت کی امامت کا اپنے زمانہ کی امامت پر قیاس کر کے دہوکہ نہ کھائے۔ شریعت میں امامت ایک بڑا منصب ہے جو نبی کی موجودگی میں صرف نبی کے لئے مخصوص ہے یا جس کو وہ اجازت دیدے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا فرمان ما کان لابن ابی قحافۃ ان یتقدم بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی رمز کی تعلیم ہے مرض وفات میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اصرار کر کے صدیق اکبرؓ ہی کو امام بنانا اسی حقیقت پر مبنی تھا۔ حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزول کے وقت امام مہدی کا امامت سے دست کش ہو جانا اسی معنی کے لحاظ سے ہے۔ ان واقعات کی تفصیل اپنے موقعہ پر دیکھی جائے۔

پھر یہ تقدم کچھ زمانۂ حیات سے ہی وابستہ نہ تھا بلکہ بعد وفات بھی اگر بضرورت ایک قبر میں کئی کئی شہداء کے دفن کرنے کی نوبت آتی تو وہاں پہلے یہی سوال کیا جاتا کہ ان میں کون اقراء ہے اور بالآخر جو اقرأ معلوم ہوتا اسی کو قبلہ کی جانب سب سے آگے رکھا جاتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں صرف حفظ کی ترغیب یا مناصب کی تقسیم یا تفصیل ثواب پر کفایت نہیں فرمائی تھی بلکہ ظاہری طور پر اس کی تعلیم و تعلم کا بھی کافی بندوبست فرمایا تھا۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں" میں کاتب وحی تھا جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے جب یہ شدت آپ سے دور ہوتی تو آپ نازل شدہ وحی لکھواتے اور میں اسے کسی دست کی ہڈی یا کسی ٹکڑے پر لکھتا جب میں لکھ چکتا تو فرماتے کہ پڑھو، میں حسب الارشاد پڑھتا اگر تحریر میں اس وقت کوئی غلطی ہو جاتی تو اس کی اصلاح کرتا اور پھر لوگوں کے سامنے اُسے لیکر آتا۔ (مجمع الزوائد)

دارمی کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ کاتبین وحی میں صرف ایک زید بن ثابت نہ تھے بلکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد ایک جماعت ہوا کرتی تھی جو لکھا کرتی تھی عن عبد اللہ بن عمرو قال بینما نحن حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکتب اذ غرض نزول وحی کے وقت اولاً اس کی کتابت اور تصحیح کا انتظام ہوتا پھر اُسے عام طور پر سنا دیا جاتا تھا اور سامعین میں بہت سے حضرات لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ایک تعلیمی درسگاہ بھی قائم تھی جس کو صُفہ کہا جاتا تھا۔ عبادۃ بن الصامتؓ اس درسگاہ کے معلم تھے۔

عن الاسود بن ثعلبۃ عن عبادۃ قال کنت	اسود بن ثعلبہ حضرت عبادہ سے روایت فرماتے ہیں
اعلم ناساً من اھل الصفۃ القرآن	کہ میں اہل صفہ کی ایک جماعت کو قرآن کی تعلیم دیا
فاھدی الی رجل منھم القوس الخ	کرتا تھا ان میں سے میرے ایک شاگرد نے میرے پاس
(طحاوی ج ۲ ص ۱۰)	ایک کمان بطور ہدیہ بھیجی۔ الحدیث۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا یہ سلسلہ کسی وقت یا کسی مکان کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ آپ کا ہر وقت اور

ہر لحظہ وقف تعلیم تھا حتیٰ کہ دعاءِ ابراہیمی میں جو لفظ زبان سے نکلے تھے اس میں بھی ویعلمھم الکتاب والحکمۃ آپ کا اہم ترین وصف تھا اور اسی کو لقد منّ اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ میں پھر لوٹایا گیا ہے۔ گویا دعاء اور اس کی اجابت دونوں میں اسی وصف کا لحاظ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ صحابہ کرام کی مجلس میں تشریف لائے دیکھا کہ ایک جماعت دعاء و تضرع میں مشغول تھی دوسری جماعت درس و تدریس میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں جماعت کی مدح فرمائی مگر اپنی جلوہ افروزی کے لئے اس جماعت کو پسند فرمایا جو درس و تدریس میں مشغول تھی اور وجہ یہی بیان فرمائی کہ انما بعثت معلما یعنی مجھے معلم بنا کر ہی بھیجا گیا ہے اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ معلمیہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ان صحابہ میں سے ہیں جو بطور فخر فرماتے ہیں کہ میں نے خود دہن مبارک سے ستر سورتیں پڑھی ہیں۔

طبقات ابن سعد جلد ثالث قسم دوم میں مصعب بن عمیر کے تذکرہ میں لکھا ہے وکان یعلم اھل المدینۃ یعنی یہ بزرگ اہلِ مدینہ کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ استیعاب میں حضرت معاذؓ کے تذکرہ میں مذکور ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو تعلیم قرآن کا بھی امر فرمایا تھا۔ غرض خود تعلیم دیا کرتے اور اکناف و اطراف میں اپنے صحابہ کو معلم بنا بنا کر بھیجا کرتے۔ سیر و تاریخ میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہی ہیں اس دور کے تعلیم و تدریس کی اہمیت کا صرف ایک نمونہ پیش کرنا ہے۔

عمر فاروقؓ کے دور میں تعلیم و تعلم قرآن کا ذوق و شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بعض جماعتوں نے اپنے شب و روز کا اسی کو ایک وظیفہ بنا لیا تھا۔

قرظہ بن کعب فرماتے ہیں کہ جب ہمیں عمر فاروقؓ نے عراق کی طرف روانہ فرمایا تو ہمارے ساتھ ساتھ تشریف لائے اور فرمایا کہ تم جانتے ہو میں تمہیں رخصت کرنے کے لئے کیوں ساتھ ساتھ آ رہا ہوں انھوں نے

کہا جی ہاں صرف ہماری دلجوئی کے لئے فرمایا کہ ہاں مگر ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ تم عراق میں ایک ایسی جماعت دیکھو گے جس کی آواز حفظ قرآن کے مشغلہ میں شہد کی مکھیوں کی طرح ہر وقت آیا کرے گی، ان کو اپنے مشغلہ سے ہٹا کر حدیث کے مشغلہ میں نہ لگانا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

غرض یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حفظِ قرآن کا سلسلہ یونہی صرف عقیدۃً قائم ہوگیا تھا بلکہ اس کے لئے منظم درسگاہیں تھیں اور مناسب انتظامات بھی کافی طور پر کردیئے گئے تھے۔ پانچ وقت نمازوں پر متفرق سورتوں کی قرأت کا التزام ہی ایک ایسا انتظام تھا کہ قرآن کے ایک بڑے حصہ کے محفوظ ہوجانے کے لئے کافی تھا اگر وہ پنجوقتہ نمازوں سے کچھ قرآن بچ جاتا تو شب کے نوافل میں آجاتا اور اگر اس سے بھی کچھ بچ رہتا، تو رمضان المبارک میں دور کرنے سے ختم ہوجاتا۔

آج بھی جو حفاظ دورانِ سال میں قرآن کریم کے ورد کا موقعہ نہیں پاتے وہ رمضان المبارک میں دور کرکے اس کی تلافی کرلیا کرتے ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر سال جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کا دور فرماتے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے اس سال دو مرتبہ دور فرمایا ہے۔ صحابہ کرام میں ایک جماعت ایسی تھی جو روزمرہ ختم قرآن کی اجازت طلب کرتی تھی مگر دربارِ نبوت سے عام طور پر اس کی اجازت نہیں ملی حضرت معاذؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کی مجھے ممانعت فرمائی۔ قیس بن صعصعہؓ کو ۱۵ یوم میں ختم قرآن کی اجازت ملی۔ غرض موقعہ و محل کے اعتبار سے ہر شخص کو جدا جدا حکم ملا۔ صحابہ کرام کے ان سوالات سے ظاہر ہے کہ ان حضرات کا سوال سارے قرآن ہی کے متعلق تھا اور بلاشبہ اسی کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب تھا جس سے ظاہر ہے کہ بہت سے صحابہ سارے قرآن کے حافظ تھے ورنہ قرآن کے کسی ایک حصہ کے پڑھنے کی اجازت طلب کرنیکا نہ کچھ مطلب ہوسکتا ہے اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ممانعت فرماسکتے ہیں۔ اس سے میری غرض

یہ ہے کہ اس طور پر مجموعِ قرآن کے حفاظ معلوم ہونے کا یہ ایک اور طریقہ بھی ہے۔

اس نظم و نسق کے بعد احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حُفّاظ کے لب و لہجہ کی بھی نگرانی فرمایا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ شب کے وقت آپ شہر میں تشریف لے گئے اور دیکھا کہ ابوبکر صدیق رضؓ آہستہ آہستہ تلاوت فرما رہے ہیں اور جب عمرؓ کے مکان سے گذرے تو ان کی آواز بلند سُنی صبح کو فرمایا کہ ابوبکرؓ ہم نے رات تمہاری آواز سُنی تھی بہت آہستہ پڑھتے ہو، عرض کیا کہ اسمعت من ناجیت جس سے سرگوشی کر رہا تھا اس کو تو سنا ہی رہا تھا حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اوقظ الوسنان واطرد الشیطان بلند آواز سے اس لئے پڑھ رہا تھا کہ سست لوگ بیدار ہو جائیں اور شیطان بھاگ جائے، ہر دو صاحبوں نے اپنے اپنے مزاج و مقام کے مناسب جواب دیا اس پر صاحبِ نبوۃ نے دونوں کی اصلاح فرمائی اور فرمایا کہ اے ابوبکرؓ تم ذرا اونچی آواز کرو اور اے عمرؓ تم ذرا نیچی کرو، یہ تعلیم و تربیت کی انتہا ہے کہ صرف تعلیم پر بس نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔ پھر ان اسباب کے بعد قرآن محفوظ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ تورات و انجیل کی محافظت کی جن اسباب نے مزاحمت کی وہ آپ نے سن لئے اور حفظِ قرآن کے جو اسباب قدرت نے مہیا کر دیئے وہ آپ نے اس مختصر تحریر میں ملاحظہ کر لئے دونوں کا موازنہ کر کے فیصلہ اپنے دل سے طلب کیجئے اگر پہلو میں منصف دل موجود ہو۔

(باقی آئندہ)

کلامِ عربی

کم فرصت شائقین عربی کے لئے یہ ایک بے نظیر کتاب ہے۔ جدید تعلیمی اصول پر لکھی گئی ہے اس میں صرف و نحو کے ضروری قواعد، ضروریاتِ زندگی سے متعلق جملے اور مکالمے، قرآن شریف و حدیث شریف کے اقتباسات، مفید امثال و اقوال، دلچسپ لطائف و حکایات، جدید طرز کے خطوط اور رقعات اور تازہ ترین عربی اخبارات اور رسائل کے انتخابات، بہترین ترتیب کے ساتھ اسباق کی صورت میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ تمام کتاب با اعراب و با ترجمہ ہے کتاب کے ساتھ ڈیڑھ ہزار ضروری الفاظ کی ایک اُردو سے عربی ڈکشنری اور ۲۵۰۰ جدید عربی الفاظ کی دوسری عربی سے اُردو ڈکشنری بھی شامل ہے۔ عام شائقین عربی کے علاوہ مدارس عربی کے طلبا بھی جدید عربی سے واقفیت و ترجمہ و گفتگو کی مشق کے لئے اس کتاب سے بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مشاہیر علمائے ہند

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی۔ حضرت علامہ حسین احمد مدنی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ حضرت مولانا محمد طیب دیوبندی وغیرہم نے کتاب کے متعلق بہترین آرا کا اظہار فرمایا ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ، تقطیع متوسط، حصہ اول ۲۰۴ صفحات۔ قیمت (۱۰؍۱)

حصہ دوم ۱۱۲ صفحات۔ قیمت دس آنے (۱۰؍)

مکتبہ برہان دہلی۔ قرول باغ